## رسائل و مسائل

# مصر و شام کا جدید عائلی قانون

کویت سے ایک عرب دوست نے، جو وہاں کے اکابر میں سے ہیں، مولانا مودودی کو مصر کے مشہور اخبار "الاہرام" کا ۲۲ فروری ۱۹۶۰ء کا شمارہ بھیجا ہے جس میں لجان توحید القوانین (مصر و شام کے قوانین کو یکساں کرنے والی کمیٹیوں) کی وہ ترمیمات شائع ہوئی ہیں جو انہوں نے "بیت الطاعۃ" کو منسوخ کرنے اور طلاق و خلع کے حق کو محدود کرنے کے بارے میں طے کی ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ مصر و شام کے اتحاد کے بعد دونوں ملکوں کے قوانین کو متحد کرنے کے لیے دو کمیٹیاں بنائی گئی تھیں جن میں ایک مسلمانوں کے شخصی قوانین کے لیے تھی اور دوسری غیر مسلموں کے شخصی قوانین کے لیے۔ چنانچہ دونوں کمیٹیوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ان شخصی قوانین (یعنی قوانین نکاح و طلاق و وراثت) کو یکجا کر دیا ہے جو عمومی لحاظ سے دونوں کے لیے یکساں رہیں گے، البتہ ایسے احکام کو علیحدہ واضح کر دیا ہے جو ہر فرقے کے مذہب سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں اور کسی دوسرے گروہ کے مذہب میں نہیں ہیں۔ دونوں کمیٹیاں اپنی اس مہم سے فارغ ہو چکی ہیں اور اب ان قوانین کو یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء سے مصر اور شام میں نافذ کر دیا جائے گا۔

مکتوب نگار نے مولانا محترم سے درخواست کی ہے کہ وہ لجان توحید القوانین کی ان ترمیمات کے بارے میں اپنی رائے سے انہیں مطلع کریں۔ ذیل میں ہم ان ترمیمات کو اور مولانا محترم کے جواب کو افادۂ عام کے لیے نقل کر رہے ہیں:

**کمیٹیوں کی ترمیمات** ۱۔ "بیت الطاعۃ" کو منسوخ قرار دیتے ہوئے کمیٹیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ

(۱) بیوی کو مسکن شرعی (خاوند کے گھر) میں جا کر بسنے کا حکم اگر کوئی عدالت دے تو یہ حکم کسی صورت میں بھی زبردستی نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی اگر عورت ناشزہ ہو جائے اور شوہر

کی درخواست پر عدالت اعادۂ حقوقِ زوجیت کی ڈگری دے دے تو اس کے معنی یہ نہ ہونگے کہ پولیس عورت کو پکڑ کر زبردستی شوہر کے گھر پہنچائے گی)

(ب) مسکن شرعی میں جانے سے بیوی کے انکار کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ اس کا حق نفقہ اس وقت تک ساقط رہے گا جب تک وہ انکار پر قائم رہے۔ خواہ خاوند کے ساتھ جانے کا حکم کسی عدالت سے جاری کیا جا چکا ہو یا نہ۔

۲۔ اگر خاوند اپنی زبان سے یا اپنے کسی فعل سے بیوی پر کوئی ایسی زیادتی کرے جو بیوی کی ہم مرتبہ عورتوں کی شان کے منافی ہو، تو خواہ اس نے یہ زیادتی خلوت سے پہلے کی ہو یا بعد میں، عدالت بیوی کے مطالبہ پر چھ ماہ تک کے لیے شوہر کے تمام حقوقِ زوجیت ساقط کر سکتی ہے۔ اس فیصلے سے بیوی کے حق نفقہ اور مطالبۂ طلاق کے حق پر کوئی اثر نہیں پڑیگا

۳۔ قانون میں وہ تمام صورتیں اور کیفیتیں بیان کر دی گئی ہیں جن میں طلاق دی جا سکتی ہے یا فسخ نکاح کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں واضح کیا گیا ہے کہ:

ا۔ فسخ نکاح ہر حالت میں قضائے قاضی (عدالتی فیصلہ) پر موقوف ہوگا۔

ب۔ طلاق صرف قاضی ہی کے روبرو واقع ہو سکتی ہے۔

طلاق اور فسخ نکاح کے فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ "طلاق کی صورت میں خاوند بیوی کے تمام حقوق ادا کرنے کا پابند ہوگا۔ لیکن اگر خاوند بیوی کو اپنی معاشرت کے لیے موزوں نہ پائے تو وہ "فسخ نکاح" کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور اس صورت میں وہ صرف بیوی کے ان ہی حقوق کا پابند ہوگا جو عدالت از روئے قانون اس پر عائد کرے گی۔ فسخ نکاح کا یہی حق بیوی کو بھی حاصل ہوگا۔

۴۔ طلاق اور فسخ نکاح کے لیے قانون میں تمام اسباب بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ان اسباب کی بنیاد یہ ہے کہ خاوند کو بیوی سے یا بیوی کو خاوند سے کوئی ضرر یا اذیت پہنچے۔

اس سلسلہ میں قانون نے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کر لینے کو بھی پہلی بیوی کے حق میں "ضرر" قرار دیا ہے جس کی بنیاد پر وہ فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

۵۔ طلاق یا فسخ نکاح یا تفریق کے لیے قانون میں جو صورت طے کی گئی ہے وہ یہ ہے:

عدالت زوجین کو بند کمرے میں اکٹھا کرے گی اور ان میں مصالحت کی کوشش کرے گی۔ اگر عدالت اس میں ناکام ہو جائے تو وہ دو ثالث مقرر کرے گی، ایک خاوند کے رشتہ داروں میں سے اور ایک بیوی کے رشتہ داروں میں سے۔ ان ثالثوں کا فرض ہو گا کہ وہ میاں بیوی کے باہمی مخالفت کے اسباب معلوم کریں اور دوبارہ ان کی مصالحت کی کوشش کریں۔

[ اگر عدالت کو زوجین کے رشتہ داروں میں سے کوئی موزوں آدمی نہ ملیں تو وہ دوسرے لوگوں میں سے بھی دو ثالث مقرر کر سکتی ہے ]

اگر یہ ثالث اصلاح احوال میں ناکام ہو جائیں تو وہ ذیل کے احکام کی، جو قانون میں واضح کر دیئے گئے ہیں، پابندی کریں گے:

(الف) اگر یہ واضح ہو جائے کہ زیادتی سراسر خاوند کی طرف سے ہے تو پھر اگر تفریق کا مطالبہ بیوی کی طرف سے ہو تو ثالث طلاق بائنہ کا فیصلہ کریں گے اور خاوند پر وہ تمام حقوق عائد کریں گے جو نکاح و طلاق کے باب میں بیوی کو حاصل ہیں۔

اگر مطالبۂ تفریق خاوند کی طرف سے ہو تو ثالث خاوند کے دعوے کو رد کر دیں گے

(ب) اگر یہ واضح ہو جائے کہ زیادتی سراسر بیوی کی طرف سے ہے تو ثالث "جبری خلع" کا فیصلہ کریں گے۔ بیوی کو پورا مہر اور دیگر تحائف خاوند کو واپس کرنے ہوں گے۔ اور نفقۂ عدت کے سوا بیوی کے تمام حقوق ساقط ہو جائیں گے۔

(ج) اگر یہ واضح ہو جائے کہ زیادتی میں دونوں برابر کے شریک ہیں تو اس صورت میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ

— اگر تفریق کا دعویٰ خاوند کی طرف سے ہو تو عدالت اس کے دعوے کو رد کر دیگی۔
— اور اگر تفریق کا دعویٰ بیوی کی طرف سے ہو یا دونوں کی طرف سے ہو تو پھر ثالث "جبری خلع" کا فیصلہ کریں گے۔ خاوند نصف مہر ادا کرے گا اور بیوی نصف تحائف واپس کرے گی۔
— اگر وہ تحائف استعمال میں آچکے ہوں تو بیوی ان کی نصف قیمت ادا کرے گی۔
— اگر زوجین کے درمیان خلوت ثابت ہو چکی ہو تو تحائف کی قیمت اُس دن کے حساب سے لگائی جائے گی جس دن مخالفت کا آغاز ہوا تھا بشرطیکہ وہ رقم قیمت خریداری سے زیادہ نہ ہو۔ اور اگر خلوت ثابت نہ ہو تو مطلقاً نصف قیمت ادا کرے گی۔

## مولانا محترم کا جواب

یہ بات بہت افسوس ناک ہے کہ پہلے اپنے ملکی قوانین (PUBLIC LAW) کے لیے کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کو چھوڑ کر مغربی مآخذ کی طرف جن مسلمان ملکوں نے مسلمان ہونے کے باوجود رجوع کیا تھا، وہ اب ہر جگہ احوالِ شخصیہ کے متعلق اسلامی قانون (PERSONAL LAW) میں بھی مغرب ہی کے نقطۂ نظر کو قبول کر کے ترمیمات کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ کفار اپنے دورِ اقتدار میں مسلمانوں پر یہ زیادتی نہ کر سکے تھے کہ ہمارے نکاح و طلاق بھی ہماری شریعت کے مطابق نہ ہو سکیں۔ یہ زیادتی اب ہم پر خود مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہو رہی ہے۔ پہلے یہ قدم ٹرکی اور البانیا میں اٹھایا گیا تھا۔ اب مصر اور تونس اس راہ پر جا رہے ہیں اور افسوس ہے کہ پاکستان کے قدم بھی اسی راہ پر اٹھ رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں آپ نے مجھے "الاہرام" کا جو پرچہ بھیجا ہے، اس میں مصر کے قوانینِ شخصیہ کی تازہ ترمیمات میں نے دیکھیں۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بیشتر ترمیمات اسلامی فقہ اور کتاب و سنت کے احکام کے بالکل خلاف ہیں۔ دراصل اس طرح کی ترمیمات اجتہاد کی تعریف میں نہیں

آتیں، کیونکہ اجتہاد کہتے ہیں کتاب و سنت سے احکام مستنبط کرنے کو۔ لیکن یہ ترمیمات مغربی افکار و نظریات اور خود اپنی خواہشِ نفس سے احکام اخذ کر کے کی گئی ہیں اور انہیں قانونِ اسلام کے نام سے زبردستی مسلمانوں پر ٹھونسا جا رہا ہے۔

ان ترمیمات میں سے جہاں تک "بیت الطاعۃ" کے اِلغاء کا تعلق ہے، میرے نزدیک یہ کچھ قابلِ اعتراض نہیں ہے[1]۔

لیکن یہ چیز بالکل خلافِ شرع ہے کہ اگر شوہر بیوی کی توہین یا دل آزاری کرے تو بیوی کے دعویٰ کرنے پر عدالت چھ ماہ کے لیے شوہر کے تمام حقوقِ زوجیت اس پر سے ساقط کر سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کے لیے کوئی ماخذ کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔ یہ صرف مغرب زدہ ذہن سے نکلی ہوئی چیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس چھ ماہ کی مدت میں عورت یا مرد کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کی ذمہ داری دنیا و آخرت میں اُن لوگوں کے سوا اور کس پر ہو گی جنہوں نے قانونِ اسلام کے احکام اور روح دونوں سے بغاوت کر کے بیویوں پر سے شوہروں کے حقوقِ زوجیت کو ساقط کرنے کا یہ اصول اپنے نفس سے گھڑ لیا ہے۔ اسلام میں تو کسی عدالت کو اس طرح کے اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں۔

اس قانون کی یہ دفعہ کہ فسخِ نکاح تمام احوال میں قضائے قاضی پر موقوف ہے، اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن اس دفعہ کا یہ جزء کہ طلاق صرف عدالت کے سامنے واقع ہو سکتی ہے بالکل غلط اور احکام شرعیہ کے قطعاً خلاف ہے۔ میں حیران ہوں کہ جو اہلِ علم حضرات اس مجلس میں شامل تھے، انہوں نے کیا سمجھ کر یہ جُز اس دفعہ میں رکھا ہے؟ کتاب و سنت میں کس جگہ اس کا کوئی ماخذ موجود ہے؟ قرآن مجید شوہر کو مطلقاً طلاق دینے کا حق دیتا ہے۔ بلکہ قرآن کے اشارات سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ طلاق گھر ہی میں شوہر اپنی بیوی کو

[1] مصر کے قانون میں بیت الطاعۃ کا مطلب یہ ہے کہ اگر عدالت کسی تائثرہ عورت کو خاوند کے گھر جا کر رہنے کا حکم دے اور وہ اس کی تعمیل نہ کرے تو پولیس زبردستی اسے خاوند کے ہاں پہنچائیگی اور وہاں اسے بند کر کے رکھا جا سکے گا۔

دے سکتا ہے۔ قرآن کی رُو سے ایک شوہر کسی کے سامنے یہ بیان کرنے پر مجبور نہیں ہے کہ وہ بیوی کو طلاق کیوں دے رہا ہے، نہ اس کے اختیار طلاق پر اس قسم کی کوئی پابندی ہے کہ وہ وجوہِ طلاق کے بارے میں کسی دوسرے شخص کو مطمئن کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جن لوگوں نے بھی اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے اپنے گھروں ہی میں دی ہے اور کوئی مثال اس کی موجود نہیں ہے کہ قاضی کے سامنے آکر طلاق دی گئی ہو یا کسی طلاق دینے والے شوہر سے یہ مطالبہ کیا گیا ہو کہ تو قاضی کو وجوہِ طلاق بتا اور ان وجوہ کی معقولیت ثابت کر۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قانون کے بعد کوئی شخص اپنے گھر میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ اگر قانوناً وہ نافذ نہ ہو اور شرعاً وہ بہرحال نافذ ہوگی تو ان میاں بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوگی؟ عدالت اور قانون کی رو سے وہ جائز میاں بیوی ہونگے، باہم مباشرت کر سکیں گے اور اولاد پیدا کر سکیں گے۔ مگر شرعاً وہ زانی ہونگے اور ان کی اولاد حرامی ہوگی، اور مسلم معاشرہ ان کے باہمی تعلق کو ہرگز حلال نہ مانے گا۔ خود ان زوجین کو بھی کبھی یہ دلی اطمینان میسر نہ ہوگا کہ وہ آپس میں حلال تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر شرعی احکام کے مطابق وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں تو انہیں عمر بھر تجرد کی زندگی گزارنی ہوگی، کیونکہ آپ کا قانون نہ عورت کو دوسرا نکاح کرنے دے گا نہ مرد کو۔

موجودہ زمانے کے قانون سازوں کو ہرگز اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان قرآن و حدیث کے بالکل معروف و مشہور احکام کے خلاف جاری کیے ہوئے قوانین کو کبھی دل سے صحیح مان لیں گے، یا ان قانون سازوں کا کبھی وہ مرتبہ تسلیم کریں گے جو ابو حنیفہ و شافعی اور مالک و ابن حنبل کا، ان کے علم و تقویٰ اور دیانت و احتیاط کی بنا پر انہوں نے تسلیم کیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جو حقوق و اختیارات شریعت نے کسی کو دیئے ہوں ان کو سلب کرنے یا ان پر بے جا پابندی عائد کرنے کا ان نام نہاد قانون سازوں کو آخر کیا حق ہے؟ طلاق کے معاملے میں عدالت کی پخ لگانے کا تصور سراسر فرنگی ہے۔ اسلامی اصول قانون سے

اس کو کوئی واسطہ نہیں حیرت یہ ہے کہ ان ضرورت سے زیادہ عقلمند لوگوں نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ بھی نہ دیکھا کہ مغربی ممالک میں طلاق کو قضائے قاضی سے مقید کر دینے کے کیا بُرے نتائج نکلے ہیں۔ عورت اور مرد کے درمیان منافرت کے بیشمار وجوہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جا سکتا، یا جن کو دوسرے لوگ محسوس کر کے معقول وجوہ نہیں مان سکتے۔ اگر طلاق عدالتی فیصلے پر موقوف ہو جائے تو لازماً ایک مرد کو اپنی بیوی پر ایسے الزامات لگانے ہونگے جن سے وہ یہ امید کر سکے کہ عدالت انہیں معقول وجوہ مانے گی۔ یہ محض قیاس نہیں ہے بلکہ مغربی ممالک کا تجربہ یہی ہے اور اس نے مغربی معاشرے کو فتنوں (SCANDALS) سے بھر دیا ہے اسلام نے ہمیں اس آفت سے بچایا تھا۔ مگر مغرب کے اندھے مقلد ہمیں اس گڑھے میں جھونک دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

اس قانون کی یہ دفعہ بھی بالکل غلط ہے کہ کسی دوسری عورت سے شادی کر لینا بھی ان قانونی اسباب میں شامل کر لیا جائے، جن کی بنا پر عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ حق خدا اور اس کے رسول نے عورت کو نہیں دیا ہے۔ اُس کے ساتھ اگر بے انصافی ہو، شوہر اس کے حقوق ادا نہ کرے، یا اسے معلق رکھ چھوڑے تو وہ بلاشبہ شرعاً عدالت سے رجوع کرنے اور انصاف کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے لیکن مجرّد اس بنیاد پر کہ شوہر نے دوسری بیوی کر لی ہے وہ فسخ نکاح کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ اگر فقہ اسلامی میں اس حق کا کوئی ماخذ کسی کے پاس ہو، تو وہ ہمیں بتائے کہ مجرد نکاح ثانی کو پہلی بیوی کے لیے فسخ نکاح کے مطالبہ کی جائز بنیاد قرار دینا کس آیت یا کس حدیث یا فقہائے مجتہدین میں سے کس کے قول پر مبنی ہے؟ اگر اسلامی قانون کے مصادر و ماخذ میں یہ چیز موجود نہیں ہے تو سیدھی طرح سے یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ اب ہمارے مسلمان قانون دان سنن انبیاء کو چھوڑ کر اس مشرک روم کی طرف رجوع کر رہے ہیں جس کا یہ نظریہ یورپ کو وراثت میں ملا ہے کہ تعدد ازواج بجائے خود ایک برائی ہے جسے مٹا دیا جانا چاہیے۔ اس برائی کے تصور کو قبول کر کے جتنی ترمیمات بھی فقہ اسلامی میں کی جائیں گی وہ سب کی سب شریعت

میں تحریف شمار کی جائیں گی نہ کہ اجتہاد۔

طلاق یا فسخ نکاح یا تفریق کے وقوع کے لیے اس جدید قانون میں جو صورتیں رکھی گئی ہیں، وہ سب فسخ و تفریق کے معاملہ میں تو ایک حد تک صحیح ہیں لیکن طلاق کے معاملہ میں قطعاً غلط ہیں۔

---

# سُود کے متعلق چند اہم مباحث

## ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا سوالنامہ اور اس کا جواب

[ پچھلے دنوں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور نے ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کی تھی جس میں سود کے متعلق چند اہم سوالات زیرِ بحث لائے گئے تھے۔ اس غرض کے لیے ادارہ نے ایک سوال نامہ مرتب کیا تھا جو زیرِ بحث مسائل پر مشتمل تھا۔ ان سوالات کا جو جواب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دیا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے ]

**سوالنامہ** | ۱۔ عرب میں پیغمبر اسلام صلعم کے زمانہ میں قرضہ لینے دینے کی شکل کیا تھی؟

۲۔ لفظ "ربٰو" کے معنی۔

۳۔ "ربٰو" اور "نفع" میں فرق۔

۴۔ ربٰو میں قرض دینے والا شرائط مقرر کرتا ہے اور بنک انٹرسٹ میں قرض لینے والا پیش کرتا ہے۔

۵۔ بیع سلم اور کمرشل انٹرسٹ میں کیا فرق ہے۔ ایک شخص ایک بھینس جو روزانہ دس سیر دودھ دیتی ہے، دوسرے کو دیتا ہے اور کہتا ہے کہ بھئی اس کے

دودھ میں سے پانچ سیر ہمیں دے دیا کرو۔ یہ جائز ہے تو پھر اس میں اور منافع پر روپیہ قرض دینے میں کیا فرق ہے؟

۶۔ ہم جنس کا تبادلہ ہم جنس سے تفاضل کے ساتھ کیوں ناجائز ہے جبکہ غیر ہم جنس کے ساتھ تفاضل جائز ہے؟

۷۔ تجارت میں طرفین کی رضامندی لازمی ہے یا نہیں؟ بعض کے نزدیک تراضیٔ طرفین کی عدم موجودگی ہی ربٰو کو پیدا کرتی ہے۔ نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا حرمتِ ربٰو کی یہی بنیاد تھی کہ اس میں ایک پارٹی پر ظلم ہوتا ہے؟ کمرشل انٹرسٹ میں کسی پارٹی پر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ اگر یہ درست ہے کہ کسی پارٹی پر ظلم نہیں ہوتا تو بنک انٹرسٹ ربٰو کے تحت کیسے آسکتا ہے؟

۸۔ (ا) صنعتی اداروں کے معمولی حصے۔

(ب) ان کے ترجیحی حصے۔

(ج) بنکوں کا فکسڈ ڈیپازٹ

(د) بنکوں سے لیٹر آف کریڈٹ کھولنا۔ اس کے مختلف پہلو۔ اگر لیٹر آف کریڈٹ کی بنا پر تجارت کے لیے قرض لینا ناجائز ہے تو اس کے لیے جائز صورت کیا ہوگی جس سے نظامِ تجارت میں خلل نہ پڑے؟

(ھ) ہاؤس بلڈنگ، فنانس کارپوریشن اور انڈسٹریل فنانس کارپوریشن۔

(و) گورنمنٹ کے قرضے (۱) اپنے ملک سے (۲) غیر ملکوں سے۔ اگر یہ تمام قرضے ناجائز ہیں تو پھر گورنمنٹ کی مشینری چلانے کے لیے کیا تجاویز ہو سکتی ہیں؟

## جوابات:

**پہلا سوال** | پہلے سوال میں دراصل تنقیح طلب امور یہ ہیں: (۱) نزولِ قرآن کے زمانہ میں تجارتی

صنعتی، زراعتی اور ریاستی اغراض کے لیے قرض کے لین دین کا دنیا میں عام رواج تھا یا نہیں؟ (۲) ان قرضوں پر سود لگایا جاتا تھا یا نہیں؟ (۳) اہل عرب میں یہ بات پوری طرح معروف تھی یا نہیں کہ ان اغراض کے لیے بھی قرض کا لین دین ہوتا ہے؟ اور (۴) اس نوعیت کے قرضوں پر اصل سے زائد جو کچھ وصول کیا جاتا تھا اس کے لیے ربٰوہی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی یا لغت عرب میں اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ مستعمل تھا؟

ان تنقیحات پر کلام کرنے سے پہلے ہمیں قبل اسلام کے عرب کی معاشی تاریخ اور بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے تاکہ یہ غلط فہمی نہ رہے کہ عرب دنیا سے الگ تھلگ پڑا ہوا ایک ملک تھا جس کے باشندے اپنی وادیوں اور صحراؤں سے باہر کی دنیا کو کچھ نہ جانتے تھے۔

زمانہ قدیم کی تاریخ سے متعلق جو مواد آج دنیا میں موجود ہے، اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ اس زمانے میں چین، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کی اور اسی طرح مشرقی افریقہ کی جتنی تجارت بھی مصر، شام، ایشیائے کوچک، یونان اور روم کے ساتھ ہوتی تھی وہ سب عرب کے واسطے سے ہوتی تھی۔ اس تجارت کے تین بڑے راستے تھے۔ ایک ایران سے خشکی کا راستہ جو عراق اور شام ہوتا ہوا جاتا تھا۔ دوسرا خلیج فارس کا بحری راستہ جس سے تمام تجارتی سامان عرب کے مشرقی سواحل پر اترتا اور اور دومۃ الجندل یا تدمر (PALMYRA) ہوتا ہوا آگے جاتا تھا۔ تیسرا بحر ہند کا راستہ جس سے آنے جانے والے تمام اموالِ تجارت حضرموت اور یمن سے گزرتے تھے۔ یہ تینوں راستے وہ تھے جن پر عرب آباد تھے۔ عرب خود بھی ایک طرف سے مال خرید کر لے جاتے اور دوسری طرف اسے فروخت کرتے تھے۔ حمل و نقل کا کاروبار (CARRYING TRADE) بھی کرتے تھے۔ اور اپنے علاقے سے گزرنے والے قافلوں سے بھاری ٹیکس لیکر انہیں بحفاظت گزارنے کا ذمہ بھی لیتے تھے۔ ان تینوں صورتوں سے ہمیشہ بین الاقوامی

تجارت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ ۲۷۰۰ برس قبل مسیح سے یمن اور مصر کے تجارتی تعلقات کا صاف ثبوت ملتا ہے۔ ۱۷۰۰ برس قبل مسیح میں بنی اسماعیل کے تجارتی قافلوں کی سرگرمیوں پر توراۃ شہادت دیتی ہے۔ شمالی حجاز میں مَدیَن (مِدیان) اور ودان (DEDAN) کی تجارت ڈیڑھ ہزار برس قبل مسیح اور اس کے بعد کئی صدی تک چلتی نظر آتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ و داؤدؑ کے زمانے (ایک ہزار سال قبل مسیح) سے یمن کے سبائی قبائل اور ان کے بعد حِمیَری قبیلے ابتدائی مسیحی صدیوں تک مسلسل تجارتی نقل و حرکت کرتے رہے ہیں۔ مسیح علیہ السلام سے لگ بھگ زمانے میں فلسطین کے یہودی عرب آکر یثرب، خیبر، وادی القریٰ (موجودہ العُلاء)، تیماء اور تبوک میں آباد ہوئے اور ان کے دائمی تعلقات، مذہبی اور ثقافتی بھی اور تجارتی بھی، شام و فلسطین اور مصر کے یہودیوں کے ساتھ برقرار رہے۔ عرب میں شام اور مصر سے غلّہ اور شراب درآمد کرنے کا کام زیادہ تر یہی یہودی کرتے تھے۔ پانچویں صدی سے قریش نے عرب کی بیرونی تجارت میں غالب حصّہ لینا شروع کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ایک طرف یمن اور حبش سے، دوسری طرف عراق سے اور تیسری طرف مصر و شام سے ان کے نہایت وسیع تجارتی تعلقات تھے۔ مشرقی عرب میں ایران کی جتنی تجارت یمن کے ساتھ تھی اس کا بہت بڑا حصّہ حیرہ سے یمامہ (موجودہ ریاض) اور پھر بنی تمیم کے علاقے سے گزرتا ہوا نجران اور یمن جاتا تھا۔ صدہا برس کے ان وسیع تجارتی روابط کی موجودگی میں یہ فرض کرنا بالکل خلافِ عقل ہے کہ بیرونی دنیا کے ان ممالک میں جو مالی معاملات اور کاروباری طریقے مروّج تھے ان کی عرب کے لوگوں کو خبر نہ ہو۔

ان تجارتی تعلقات کے علاوہ سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے بھی عرب کے لوگوں کا اپنے گرد و پیش کی مہذب دنیا سے گہرا رابطہ تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں شمالی حجاز کے مقام تیماء کو بابل کے بادشاہ نیبونیدوس (NABONIDUS) نے اپنا گرمائی دارالسلطنت بنایا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ بابل میں جو معاشی قوانین اور طریقے رائج تھے ان سے حجاز کے لوگ بے خبر رہ گئے ہوں۔ تیسری صدی قبل مسیح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک پہلے

بطرا (PETRA) کی نبطی ریاست، پھر تدمر کی شامی ریاست، اور اس کے بعد حیرہ اور غسان کی عربی ریاستیں عراق سے مصر کے حدود تک اور حجاز و نجد کے حدود سے الجزیرہ اور شام کے حدود تک مسلسل قائم رہیں۔ ان ریاستوں کا ایک طرف یونان و روم سے، اور دوسری طرف ایران سے نہایت گہرا سیاسی، تمدنی، تہذیبی، اور معاشی تعلق رہا ہے۔ پھر نسلی رشتوں کی بنا پر اندرون عرب کے قبائل بھی ان کے ساتھ وسیع تعلقات رکھتے تھے۔ مدینہ کے انصار اور شام کے غسانی فرمانروا ایک ہی نسل سے تھے اور ان کے درمیان پیہم تعلقات قائم رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خود آپ کے خاص شاعر حضرت حسان بن ثابت غسانی امراء کے ہاں آتے جاتے تھے۔ حیرہ کے امراء سے قریش والوں کا بہت میل جول تھا، حتیٰ کہ قریش کے لوگوں نے لکھنا پڑھنا بھی انہی سے سیکھا اور حیرہ ہی سے وہ رسم الخط انہیں ملا جو بعد میں خط کوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ ان تعلقات کے ہوتے یہ لوگ یونان و روم اور مصر و شام اور عراق و ایران کے مالی و معاشی معاملات سے بالکل ناواقف رہ گئے ہوں

مزید براں عرب کے ہر حصے میں شیوخ، اشراف، اور بڑے بڑے تاجروں کے پاس رومی، یونانی اور ایرانی لونڈیوں اور غلاموں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ایران و روم کی لڑائیوں میں دونوں طرف کے جو جنگی قیدی غلام بنائے جاتے تھے، ان میں سے زائد از ضرورت تعداد کو کھلے بازار میں فروخت کر دیا جاتا تھا، اور عرب اس مال کی بڑی منڈیوں میں سے ایک تھا۔ ان غلاموں میں اچھے خاصے پڑھے لکھے مہذب لوگ بھی ہوتے تھے اور صنعت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگ بھی۔ عرب کے شیوخ اور تجار ان سے بہت کام لیتے تھے۔ مکہ، طائف، یثرب اور دوسرے مرکزوں میں ان کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور یہ کاریگروں کی حیثیت سے، یا تجارتی کارخانوں کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کی قیمتی خدمات بجا لاتے تھے۔ آخر یہ کس طرح ممکن تھا کہ اپنے ان مددگاروں کے ذریعہ سے کسی عرب تاجر کے کان میں کبھی یہ بات نہ پڑی ہو کہ گرد و پیش کی دنیا میں مالی و کاروباری معاملات کے کیا طریقے رائج ہیں۔

اس کے ساتھ عرب کی معاشی تاریخ کا ایک اور پہلو بھی نگاہ میں رہنا چاہیے۔ عرب کسی زمانہ میں بھی نہ تو خوراک کے معاملہ میں خود کفیل رہا ہے، اور نہ وہاں ایسی صنعتوں کو فروغ نصیب ہوا ہے جن سے تمام ضرورت کے سامان ملک ہی میں فراہم ہو جاتے ہوں۔ اس ملک میں ہمیشہ اشیائے خوردنی بھی باہر سے درآمد ہوتی رہی ہیں اور ہر طرح کی مصنوعات بھی، حتیٰ کہ پہننے کے کپڑے تک زیادہ تر باہر ہی سے آتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب کے عہد میں یہ درآمدی تجارت زیادہ تر دو گروہوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایک قریش اور ثقیف۔ دوسرے یہود۔ لیکن یہ لوگ مال درآمد کر کے صرف تھوک فروشی ہی کرتے تھے۔ اندرون ملک کی چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبائلی ٹھکانوں میں خردہ فروشی کرنا ان کا کام نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا اور نہ قبائل اس بات کو کبھی گوارا کر سکتے تھے کہ سارے تجارتی فائدے یہی لوگ لوٹ لے جائیں اور ان کے اپنے آدمیوں کو اس اجارہ داری میں گھسنے کا کسی طرف سے راستہ نہ ملے۔ اس لیے تھوک فروش کی حیثیت سے یہ لوگ اندرونِ ملک کے خردہ فروش تاجروں کے ہاتھ لاکھوں روپے کا مال فروخت کرتے تھے، اور اس کا ایک معتدبہ حصہ اُدھار فروخت ہوتا تھا۔ شاید دنیا میں تھوک فروش اور خردہ فروش کے درمیان کبھی اور کہیں خالص نقد لین دین کا طریقہ رائج نہیں رہا ہے۔ اس لین دین میں اُدھار بالکل ناگزیر ہے جس سے کبھی مفر نہ تھا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ صرف عرب ہی میں اس وقت یہ لین دین بالکل نقد نقد کی شرط پر ہوتا تھا اور قرض کا اس میں کوئی دخل نہ تھا، تو عقلاً بھی یہ قابلِ قبول نہیں ہے، اور تاریخی طور پر بھی یہ غلط ہے، جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

اب میں ان تنقیحات کو لیتا ہوں جن کا ذکر میں نے آغاز میں کیا تھا۔

یہ امر کہ قدیم زمانے میں قرض صرف ذاتی و شخصی ضرورتوں ہی کے لیے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ تجارتی، صنعتی، اور زراعتی اغراض کے لیے بھی اس کا عام رواج تھا اور حکومتیں بھی اپنی ریاستی اغراض کے لیے قرض لیتی تھیں، تاریخ سے بالکل ثابت ہے اور یہ دعویٰ کرنے کے

لیے کوئی بنیاد نہیں ہے کہ پرانی دنیا میں قرض کا لین دین صرف شخصی حاجتوں کے لیے ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ قرض پر اصل سے زائد ایک طے شدہ مقدار مال لینے کا طریقہ، شخصی اور کاروباری معاملات کے درمیان کسی قسم کا امتیاز کیے بغیر ہر قسم کے قرضوں کی صورت میں رائج تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۴۶ء) کے مضمون (BANKS) میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل اور مصر کے مندر صرف عبادت گاہ ہی نہ تھے بلکہ بینک بھی تھے۔ بابل کے آثار قدیمہ میں جو گلی تختیاں (CLAY TABLETS) ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار فصل سے پہلے اپنی زرعی ضروریات کے لیے مندروں سے قرضے لیتے تھے اور فصل کاٹنے کے بعد مع سود یہ قرض ادا کرتے تھے۔ یہ ساہوکاری نظام دو ہزار برس قبل مسیح میں پایا جاتا تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں پرائیویٹ بینک بھی بابل میں کام کرتے پائے جاتے ہیں۔ ۵۷۵ ق م میں بابل کے (EGIBI BANK) کا وجود ملتا ہے جو زمینداروں کو زرعی اغراض کے لیے قرض دیتا تھا۔ نیز یہ بینک لوگوں کے ڈپازٹ اپنے پاس رکھ کر ان پر سود ادا بھی کرتا تھا۔

(یاد رہے کہ یہ وہی زمانہ تھا جب شمالی حجاز کا شہر تیما بابل کی سلطنت کا گرمائی دارالسلطنت تھا)

ول ڈورانٹ اپنی کتاب (A STORY OF CIVILIZATION) میں بابل کے متعلق لکھتا ہے:

"ملک میں اندوختے قانون ۲۰ فی صدی نقد روپے کے قرضوں پر، اور ۳۳ فی صدی سالانہ اجناس کی صورت میں قرضوں پر سود مقرر تھا۔ بعض طاقتور خاندان نسلاً بعد نسلٍ ساہوکارے کا کام کرتے اور صنعت پیشہ لوگوں کو سود پر قرضے دیتے تھے۔ ان کے علاوہ مندروں کے پروہت فصلوں کی تیاری کے لیے

زمینداروں کو قرض دیا کرتے تھے۔"

اس سلسلے میں آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:

"ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی سود خواری وہ قیمت تھی جو ہماری صنعت کی طرح بابل کی صنعت بھی ایک پیچیدہ نظام قرض کے ذریعہ سے سیراب ہونے کے بدلہ میں ادا کر رہی تھی۔ بابل کا تمدن اصلاً ایک تجارتی تمدن تھا۔ جتنی دستاویزیں بھی اس کے آثار سے اس زمانہ میں برآمد ہوئی ہیں وہ زیادہ تر کاروباری نوعیت کی بیع فروخت، قرضے، ٹھیکے، شراکت، دلالی، مبادلہ، اقرارنامے، تمسکات، اور اسی طرح کے دوسرے امور[1]"

اسیریا کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں سیناکریب کے زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے ول ڈورانٹ لکھتا ہے:

"صنعت اور تجارت کو ایک حد تک نجی کاروبار کرنے والے ساہوکار سرمایہ فراہم کر کے دیتے اور ان قرضوں پر ۲۵ فی صدی سالانہ سود وصول کرتے تھے[2]"

یونان کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون (Banks) میں بیان کیا گیا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح سے وہاں بینک کاری کے باقاعدہ نظام کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نظام میں ایک قسم کے بینک وہ تھے جو لوگوں کے مال بطورِ امانت اپنے پاس رکھتے تھے اور اس پر سود دیتے تھے۔

ول ڈورانٹ لکھتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ڈیلفی کا اپالو مندر تمام یونانی دنیا کا بین الاقوامی بینک تھا۔ اس سے اشخاص کو بھی اور ریاستوں کو بھی معتدل شرح سُود پر قرضے حاصل ہوتے تھے۔ اسی طرح پرائیویٹ صراف ۱۲ سے ۳۰ فی صدی تک شرح سود پر تاجروں کو قرضے دیتے تھے۔ یونانیوں نے یہ طریقے مشرقِ قریب (بابل، مصر اور شام) سے سیکھے اور بعد میں روم نے ان

---

[1] جلد اول ص ۲۲۵–۲۲۹ [2] جلد اوّل، ص ۲۷۴۔

طریقوں کو یونان سے سیکھا۔ پانچویں صدی کے آخر میں بعض بڑے بڑے پرائیویٹ بینک یونان میں قائم ہو چکے تھے۔ انہی کے ذریعہ سے ایتھنز کی تجارت پھیلنی شروع ہوئی۔[1]

اس کے بعد روم کا دور آتا ہے۔ وِل ڈیورانٹ لکھتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح میں روم کی بینک کاری پورے عروج پر تھی۔ ساہوکار لوگوں کے ڈپازٹ رکھتے تھے اور ان پر سود ادا کرتے تھے۔ قرض لیتے بھی تھے اور دیتے بھی تھے۔ کاروبار میں اپنا روپیہ بھی لگاتے تھے اور دوسروں کا بھی لگواتے تھے۔[2] پہلی صدی عیسوی میں رومی سلطنت کے ہر حصے میں بینک قائم ہو چکے تھے۔ بینک کاری کے دوسرے کاموں کے ساتھ یہ لوگوں کے ڈپازٹ رکھ کر سود دیتے اور آگے روپیہ قرض دے کر سود وصول کرتے تھے۔ یہ کاروبار زیادہ تر یونانیوں اور شامیوں کے ہاتھ میں تھا۔ گال (GAUL) میں تو شامی اور ساہوکار دونوں ہم معنی لفظ ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں سرکاری خزانہ بھی زمینداروں کو فصل کی کفالت پر سودی قرضے دیتا تھا۔ آگسٹس کے زمانہ میں شرح سود ۴ فی صدی تک گر گئی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد شرح ۶ فی صدی تک اور قسطنطین کے زمانہ میں ۱۲ فی صدی تک چڑھ گئی۔[3]

اسی پہلی صدی عیسوی کے متعلق بیرن (BARON) اپنی کتاب (A RELIGIOUS AND SOCIAL HISTORY OF THE JEWS) میں بیان کرتا ہے کہ اسکندریہ کے یہودی بینکرز الیگزینڈر اور ڈیمیٹریس نے یہودیہ کے بادشاہ اگریپا اوّل کو دو لاکھ درہم (تقریباً ۴۰ ہزار ڈالر) قرض دیئے تھے۔[4]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل قریب کے زمانہ میں قیصرِ روم جسٹینین نے (جس کی وفات آنحضرت کی پیدائش سے صرف پانچ برس قبل ہوئی تھی)، تمام بزنطینی سلطنت میں اندر وئے قانون زمینداروں اور کاشتکاروں کے قرضوں پر ۴ فی صدی، شخصی قرضوں پر ۶ فی صدی، تجارتی

---

[1] جلد اول، ص ۶۳-۲۶۲۔ [2] جلد سوم، ص ۸۸۔

[3] جلد سوم، ص ۳۶-۱۴۱ [4] جلد اول ص ۲۶۱

اور صنعتی قرضوں پر ۸ فی صدی، اور بحری تجارت کے قرضوں پر ۱۲ فی صدی شرح سُود مقرر کی تھی۔ یہ قانون جسٹینین کے بعد بھی ایک مدت تک بیزنطینی سلطنت میں رائج رہا[1]۔ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جس بیزنطینی سلطنت میں سُود کا یہ قانون رائج تھا اس کی سرحدیں شمالی حجاز سے ملی ہوئی تھیں۔ شام، فلسطین اور مصر کے تمام علاقے اس کے زیرنگین تھے۔ قریش کے تاجر ان علاقوں کی منڈیوں میں پیہم آمد و رفت رکھتے تھے۔ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بچپن سے آغازِ نبوت تک مسلسل تجارتی قافلوں کے ساتھ ان منڈیوں میں جاتے رہتے تھے۔ آخر یہ بات کیسے فرض کی جا سکتی ہے کہ قریش کے ان تاجروں کو اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بازاروں میں کاروبار کرتے ہوئے کبھی یہ پتہ نہ چلا کہ بیزنطینی سلطنت میں تجارت، صنعت اور زراعت کی اغراض کے لیے بھی قرض کے لین دین کا رواج ہے اور اس پر از روئے قانون سُود کی شرحیں مقرر ہیں؟

عین زمانہ نبوت میں روم اور ایران کے درمیان وہ زبردست لڑائی ہو رہی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ روم میں کیا گیا ہے۔ اس لڑائی میں جب ہرقل نے خسرو پرویز کے مقابلہ پر ہجومی جنگ کا آغاز کیا، اس وقت اپنی جنگی ضروریات کے لیے اسے کلیساؤں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض لینی پڑی تھی[2]۔ اب کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ جس عظیم الشان لڑائی نے عراق سے مصر تک عرب کے سارے بالائی حصے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا، جس میں ایران کی زبردست فتوحات کے ہر طرف چرچے ہو رہے تھے، اور جس میں سلطنت روم کے گرتے ہوئے قصر کو بچانے کے بعد اب قیصر نے یکایک خسرو کے مقابلے پر وہ حیرت انگیز پیش قدمی کی تھی جو ساسانی دارالسلطنت، مدائن کی تباہی پر جا کر ختم ہوئی، اس لڑائی کا یہ واقعہ عرب کے لوگوں سے بالکل پوشیدہ رہ گیا ہوگا کہ قیصر نے اپنی اس پیش قدمی کے لیے سرمایہ

---

[1] ول ڈورانٹ، جلد چہارم، ص ۱۲۰ و ۴۲۶۔ گبن، زوال و سقوط دولت روم، ج ۲۔ ص ۷۱۶۔

[2] CAMBRIDGE ECONOMIC HISTORY OF EUROPE, V. 2, P. 90
GIBBON, DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE, V. 2, P. 791

کلیساؤں سے سود پر حاصل کیا ہے ؟ مجوسیوں سے عیسائیت کو بچانے اور بیت المقدس ہی کو نہیں مقدس صلیب کو بھی مشرکین کے قبضے سے نکالنے کے لیے جنگ کی جاتے ، اور کلیسا کے پادری اس کار خیر کے لیے سود پر قرض دیں ، یہ عجیب و غریب واقعہ آخر ان لوگوں کے علم میں آنے سے کیسے بچ سکتا تھا جن کی نگاہیں دنیا کی ان دو عظیم ترین سلطنتوں کی جنگ کے نتیجے پر لگی ہوئی تھیں ؟ خصوصاً قریش اس سے کیسے ناواقف ہو سکتے تھے جبکہ سورۂ روم کے نازل ہونے پر اسی جنگ روم و ایران کے معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ اور سرداران قریش کے درمیان باقاعدہ شرط لگ چکی تھی ؟

یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ عرب کے نہایت قریبی تعلقات مشرق اوسط کی معاشی و تمدنی اور سیاسی زندگی کے ساتھ قدیم ترین زمانے سے وابستہ رہے ہیں ، اور اس خطۂ زمین میں ڈھائی ہزار سال سے تجارتی ، صنعتی ، زراعتی اور ریاستی اغراض کے لیے قرض کے لین دین اور اس پر سود وصول کرنے کا رواج رہا ہے اور اہلِ عرب کا اس رواج عام سے بے خبر اور غیر متأثر رہنا قطعاً قابلِ تصور نہیں ہے ۔

اب خود عرب کے مالی معاملات کو دیکھیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے میں پہلے یہ بتا چکا ہوں کہ عرب کی ضروریات کے لیے غلّہ اور شراب زیادہ تر یہودی درآمد کرتے تھے اور باقی دوسرا سامان زیادہ تر مکہ اور طائف کے تاجر بیرونی علاقوں سے لاتے تھے میں یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ قریش اور ثقیف اور یہود کا یہ سارا کاروبار تھوک فروشی کی حد تک تھا ۔ اندرون ملک میں خردہ فروشی دوسرے لوگ کرتے تھے اور وہ ان تھوک فروشوں سے مال خرید کر لے جایا کرتے تھے ۔ میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ تھوک فروشوں اور خردہ فروشوں کے درمیان بالکل نقدا نقد کی شرط پر کاروبار دنیا میں کبھی کہیں نہیں رہا ہے اور عرب میں بھی نہیں تھا ۔ اس کے بعد ذرا اُن روایات کو ملاحظہ فرمائیے جو آیت ربوٰ کی تفسیر میں عہد رسالت سے قریب زمانہ کے مفسرین سے منقول ہوئی ہیں ۔ ضحاک ، ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

کان ربا یتبایعون بہ فی الجاھلیۃ[1]

یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے۔

قتادہ کہتے ہیں:

ان ربا اھل الجاھلیۃ یبیع الرجل البیع الی اجل مسمی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبہ قضاہ زادہ واخر عنہ[2]

اہلِ جاہلیت کا ربا یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کرتا اور قیمت ادا کرنے کے لیے ایک مدت طے ہو جاتی۔ اب اگر وہ مدت پوری ہو گئی اور خریدار کے پاس اتنا مال نہ ہوتا کہ قیمت ادا کرے تو بیچنے والا اس پر زائد رقم عائد کر دیتا اور مہلت بڑھا دیتا۔

سُدّی کہتے ہیں:

نزلت ھذہ الآیۃ فی العباس بن عبد المطلب ورجل من بنی المغیرۃ کانا شریکین فی الجاھلیۃ سلفا فی الربا الی اناس من ثقیف من بنی عمرو فجاء الاسلام ولھما اموال عظیمۃ فی الربا[3]

آیت وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰا عباس بن عبد المطلب اور بنی المغیرہ کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ دونوں جاہلیت کے زمانے میں شریک تھے اور انھوں نے ثقیف کے بنی عمرو میں لوگوں کو سودی قرض پر مال دے رکھے تھے جب اسلام آیا تو ان دونوں کا بڑا سرمایہ سُود میں لگا ہوا تھا۔

یہ سب روایات خُردہ فروشوں کے ہاتھ اُدھار پر مال فروخت کرنے اور اس پر سود لگانے کی خبر دیتی ہیں، اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس تجارتی سود کے لیے بھی الربا کی اصطلاح ہی

---

[1] ابن جریر، ج ۳، ص ۷۱۔ [2] ایضاً، ص ۶۷۔

[3] " " ص ۷۱۔

استعمال ہوتی تھی، کوئی دوسرا لفظ ایسا نہ تھا جو تجارتی قرضوں کے لیے مستعمل ہو اور الربا عرف ان قرضوں کے سود پر بولا جاتا ہو جو خالص شخصی حاجات کے لیے حاصل کیے جاتے تھے۔

پھر بخاری میں سات مقامات[1] پر اور نسائی میں[2] ایک مقام پر صحیح سندوں کے ساتھ یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے دوسرے شخص سے تجارت کے لیے ایک ہزار دینار قرض لیے اور کہا کہ میرے اور تیرے درمیان اللہ گواہ اور اللہ ہی کفیل ہے۔ پھر وہ بحری سفر پر چلا گیا۔ وہاں جب وہ اپنے کاروبار سے فارغ ہوا تو واپسی کے لیے اسے کوئی جہاز نہ ملا اور وہ مدت پوری ہو گئی جس کی قرارداد کر کے اس نے قرض لیا تھا۔ آخر اس نے یہ کیا کہ ایک لکڑی کے اندر سوراخ کر کے ایک ہزار دینار اس میں رکھ دیے اور قرض خواہ کے نام ایک خط بھی لکھ کر ساتھ رکھا اور سوراخ بند کر کے لکڑی سمندر میں چھوڑ دی اور اللہ سے دعا کی کہ میں نے تجھی کو گواہ اور کفیل بنا کر یہ رقم اس شخص سے قرض لی تھی، اب تو ہی اسے اس تک پہنچا دے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ قرض خواہ ایک روز اپنے ملک میں سمندر کے کنارے کھڑا تھا، یکایک لکڑی کا ایک لٹھا اس کے سامنے آ کر رکا۔ اس نے لکڑی کو اٹھا کر دیکھا تو قرضدار کا خط بھی اسے ملا اور ایک ہزار دینار بھی مل گئے۔

یہ روایت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ تجارت کے لیے قرض لینے کا تخیل اس وقت عربوں میں غیر معروف نہ تھا۔

ابن ماجہ[3] اور نسائی[4] میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے موقع پر عبداللہ بن ربیعہ مخزومی سے ۳۰ یا ۴۰ ہزار درہم قرض لیے تھے اور جنگ سے واپسی پر یہ قرض آپ نے ادا فرمایا۔ یہ ریاستی اغراض کے لیے قرض کی صریح مثال ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ (باب ما یستخرج من البحر)، کتاب الشروط، کتاب الاستقراض، کتاب الکفالہ، کتاب اللقطہ، کتاب الاستیذان، اور کتاب البیوع (باب التجارۃ فی البحر)۔

[2] نسائی، کتاب اللقطہ [3] ابواب التجارات، باب حسن القضاء [4] کتاب البیوع، باب الاستقراض

ایک دوست نے دو اور واقعات کی طرف بھی مجھے توجہ دلائی ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ پہلا واقعہ ہند بنت عتبہ کا ہے کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیت المال کا چار ہزار روپیہ (غالباً درہم) تجارت کے لیے قرض حاصل کیا تھا۔[1]

دوسرا واقعہ بھی حضرت عمرؓ ہی کے عہد کا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری (البصرہ کے گورنر) نے بیت المال کا روپیہ حضرت عمرؓ کے دو صاحبزادوں، عبداللہ اور عبیداللہ کو تجارت کے لیے قرض دیا۔ مگر بعد میں حضرت عمرؓ نے اس قرض کو قابل اعتراض قرار دیکر اصل کے علاوہ پورے منافعہ کا بھی اپنے صاحبزادوں سے مطالبہ کیا، اور آخر کار لوگوں کے مشورے سے اس کو قرض کے بجائے قراض (مضاربت) قرار دے کر آدھا منافعہ وصول کیا۔[2]

یہ دونوں مثالیں زمانۂ جاہلیت سے بہت قریب کے دَور کی ہیں۔ عرب میں ۹ھ تک سودی کاروبار چلتا رہا ہے۔ یہ واقعات اس کی آخری بندش سے صرف دس بارہ سال بعد کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل مدت میں تصورات نہیں بدل جاتے ہیں۔ اس لیے ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قرض پر سرمایہ لیکر تجارت کرنے کا تصور عہدِ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔

رہی یہ بات کہ اسلامی عہد کے مؤرخین اور محدثین و مفسرین نے شخصی حاجات اور تجارتی و کاروباری قرضوں کا واضح طور پر الگ الگ کیوں ذکر نہ کیا، تو اس کا ظاہر سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں قرض، خواہ جس غرض کے لیے بھی ہو، قرض ہی سمجھا جاتا تھا اور اس پر سُود کی حیثیت بھی ان کی نگاہ میں یکساں تھی۔ انہوں نے نہ اس تصریح کی کوئی خاص ضرورت محسوس کی کہ بھوکے مرتے ہوئے لوگ پیٹ بھرنے کے لیے قرض لیتے تھے، اور نہ خاص طور پر اسی بات کو تفصیل سے بیان کرنا ضروری سمجھا کہ کاروبار کے لیے لوگ قرض لیا کرتے تھے۔ ان امور کی تفصیلات خال خال ہی کہیں ملتی ہیں جن سے صحیح صورتِ حال سمجھنے کے لیے عرب کے حالات کو اس وقت کی دنیا کے مجموعی

---

[1] تاریخ طبری، لسلسلۂ واقعات ۲۳ھ، عنوان: شیٔ من سیرۃ مما لم یمض ذکرہ۔

[2] مؤطا، کتاب القراض۔

حالات میں رکھ کر دیکھنا ناگزیر ہے۔ مختلف قرضوں کے درمیان اُن کی اغراض کے لحاظ سے فرق و امتیاز کر کے ایک مقصد کے قرض پر سود کو جائز اور دوسرے مقصد کے قرض پر اس کو ناجائز ٹھیرانے کا تخیل غالباً چودھویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا میں نہ پایا جاتا تھا۔[1] اُس وقت تک یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے تمام اہلِ دین اور اسی طرح اخلاقیات کے ائمہ بھی اس بات پر متفق تھے کہ ہر قسم کے قرضوں پر سود ناجائز ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ زمانۂ قبل اسلام میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ لوگ قرض کے سرمایہ سے تجارت کر سکیں، کیونکہ ملک میں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی، ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی، تجارتی قافلوں کو بہت بھاری ٹیکس دے دے کر مختلف قبائل کے علاقوں سے گزرنا پڑتا تھا اور اِن پُرخطر حالات کی وجہ سے شرح سود تین چار سو فیصدی تک پہنچی ہوتی تھی جس پر قرض لے کر کاروبار میں لگانا کسی طرح نفع بخش نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ قیاس آرائی اصل تاریخی حالات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ محض ایک مفروضہ ہے جو تاریخ سے بے نیاز ہو کر صرف اِس گمان پر قائم کر لیا گیا ہے کہ عرب میں جب کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی اور عام بدامنی پھیلی ہوئی تھی تو ضرور اس کے نتائج یہی ہونگے۔ حالانکہ تاریخی واقعات یہ بتاتے ہیں کہ اسلام سے قریب کے عہد میں ایران و روم کی پیہم لڑائیوں اور سیاسی کشمکش کی بدولت چین، انڈونیشیا، ہندوستان اور مشرقی افریقہ کے ساتھ رومی دنیا کے جتنے بھی تجارتی تعلقات تھے ان کا واسطہ مکہ کے عرب تاجر ہی تھے۔ مشرق کا سارا مالِ تجارت خلیج فارس اور بحرِ عرب کے بندرگاہوں پر اترتا اور وہاں سے مکہ پہنچ کر رومی دنیا میں جاتا تھا۔ اور اسی طرح رومی دنیا کے سارے اموالِ تجارت قریش ہی کے قافلے مکہ لاتے اور پھر ان بندرگاہوں تک پہنچاتے تھے جن پر مشرق کے تاجر آیا کرتے تھے۔ اولیاری لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں مکہ بینک کاری کا مرکز بن گیا تھا جہاں دور دراز علاقوں کے لیے ادائیگیاں کی جا سکتی تھیں، اور وہ بین الاقوامی

[1] HENRY PIRENNE, ECONOMIC AND SOCIAL HISTORY OF MEDIEVAL EUROPE, (ENGLISH TRANSLATION), 4 EDITION, BUTTER, LONDON, 1949, P. 140

تجارت کا گھر بنا ہوا تھا۔[1]

(MECCA HAD BECOME A BANKING CENTRE WHERE PAYMENTS COULD BE MADE TO MANY DISTANT LANDS, AND A CLEARING HOUSE OF INTERNATIONAL COMMERCE

یہ چمکتی ہوئی تجارت آخر کیسے چل سکتی تھی اگر حالات وہ ہوتے جو فرض کیے گئے ہیں معاشی قوانین کی سرسری واقفیت بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ جہاں بدامنی کی وجہ سے کاروبار اس قدر کثیر المصارف اور پُرخطر ہو کہ تجارتی سُود کی شرح تین چار سو فی صدی تک پہنچ جائے وہاں لازماً مالِ تجارت کی لاگت (COST PRICE) بھی اس حد تک بڑھ جانی چاہیے کہ بیرونی منڈیوں میں لے جا کر انہیں منافع کے ساتھ فروخت کرنا غیر ممکن ہو جائے۔ آخر اتنی چڑھی ہوئی قیمتوں پر یہ مال مصر و شام کے بازاروں میں کیسے بک جاتا تھا؟ دراصل عرب میں اُس ساری بدامنی و بدنظمی کے باوجود جس کا ذکر کیا جاتا ہے، بڑے پیمانے کی تجارت وہ قبیلے کرتے تھے جو بجائے خود طاقت ور ہوتے تھے، بڑے بڑے قبیلوں سے جنہوں نے حلیفانہ معاہدات بھی کر رکھے تھے، سود پر لاکھوں روپے کا مال قبیلوں میں پھیلا کر بھی جنہوں نے بکثرت لوگوں کو اپنے کاروبار کی گرفت میں لے لیا تھا، اور سرداران قبائل کو ہر طرح کے سامانِ تعیش بہم پہنچا کر بھی جنہوں نے اپنے وسیع اثرات قائم کر لیے تھے۔ اس کے علاوہ خود قبائل کا اپنا مفاد بھی اس کا متقاضی تھا کہ ان کو وہ ناگزیر ضروریاتِ زندگی، غلہ کپڑا وغیرہ بہم پہنچیں جو باہر سے درآمد ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے ان طاقتور قبیلوں کو بڑے بڑے تجارتی قافلے لے کر، جن میں بسا اوقات ڈھائی ڈھائی ہزار اونٹ ہوتے تھے، عرب کے راستوں سے گزرنے کے لیے اس قدر بھاری ٹیکس نہیں دینے پڑتے تھے، اور نہ خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس قدر خطیر مصارف اٹھانے پڑتے تھے کہ اموالِ تجارت کی قیمتیں ناقابلِ فروخت حد تک چڑھ جائیں۔ بیرونی تجارت کے علاوہ خود عرب کے مختلف حصّوں میں سال کے سال تقریباً ۲۰ مرکزی مقامات پر باقاعدہ ہاٹ (سوق) لگتے تھے جن کا ذکر

[1] ARABIA BEFORE MOHAMMAD, P. 182

ہمیں تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان ہاٹوں میں عرب کے ہر ہر حصے سے قافلے آکر خرید و فروخت کرتے اور ان میں سے بعض میں روم و ایران اور چین و ہندوستان تک کے تاجر آیا کرتے تھے۔ یہ پیہم تجارتی نقل و حرکت آخر کیسے جاری رہ سکتی تھی اگر عرب کے حالات اُتنے ہی خراب ہوتے جتنے فرض کرلیے گئے ہیں۔ مؤرخین نے قریش کے تجارتی کاروبار کے متعلق یہ تصریح کی ہے کہ وہ سو فیصدی منافع کمایا کرتے تھے[1] ایسے منافعہ کے کاروبار کے لیے سودی قرض پر سرمایہ نہ مل سکنا، اور شرح سود تین چار سو فیصدی تک ہونا قطعاً خارج از فہم ہے۔ اور اس دعوے کے لیے کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہے کہ عرب میں شرح سود اس قدر چڑھی ہوئی تھی۔

(باقی)

(بقیہ آئین کمیشن کا سوالنامہ) پر مبنی ہونا چاہیے کہ مملکت کے قانون کا اولین ماخذ قرآن اور سنت ہونگے

۲۔ صدرِ مملکت کا انتخاب دستور نافذ ہونے کے بعد از سرِ نو ہونا چاہیے۔

۳۔ ملک کے دستور میں لازماً ان امور کی صراحت ہونی چاہیے کہ:

(الف) ملک میں مارشل لا صدرِ مملکت کے باقاعدہ اعلان کے ذریعہ سے صرف اُن حالات میں لگایا جاسکیگا جبکہ ملک میں کھلی بغاوت رونما ہو اور سول گورنمنٹ اسے رفع کرنے میں ناکام ہو جائے، یا جبکہ حالتِ جنگ میں دفاعی اغراض کے لیے اس کی ضرورت ہو۔

(ب) مارشل لا صرف اس وقت تک نافذ رہ سکے گا جب تک دیوانی حکومت انتظام سنبھالنے کے قابل ہو جائے

(ج) مارشل لا کے حکام کا فرض قیامِ امن سے زائد کچھ نہ ہوگا۔

(د) مارشل لا کے حکام کسی غیر فوجی آدمی پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کے مجاز نہ ہونگے (یا کم از کم یہ کہ صرف ایسے لوگوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاسکے گا جو بالفعل مسلح مزاحمت کرتے ہوئے، یا حملہ آور دشمن سے عملاً تعاون کرتے ہوئے گرفتار ہوں)

(ھ) مارشل لا کے احکام کا اطلاق کسی حالت میں مارشل لا سے پہلے کے افعال پر نہ ہوسکے گا۔

(و) کسی انڈمنٹی ایکٹ میں مارشل لا کے حکام کو صرف اُن افعال سے بری الذمہ کرنے کی گنجائش رکھی جائیگی جو نیک نیتی کے ساتھ کیے گئے ہوں اور ان کا ارتکاب قیامِ امن کی ضرورت کے لیے ناگزیر ہو۔

(ز) مارشل لا کے بعد سزاؤں اور ضبطیوں وغیرہ کے احکام کے خلاف لوگوں کو سپریم کورٹ میں اپیل کرنیکا حق ہوگا

ہماری یہ تجاویز نہ صرف انصاف کے معروف اصولوں پر مبنی ہیں، بلکہ ہم معزز ارکانِ کمیشن کو توجہ دلائیں گے کہ وہ براہِ کرم سنہ ۱۸۰۴ء کا ریگولیشن ۱۰، اور وہ ہدایات جو مارشل لا کے سلسلے میں لارڈ ولزلی نے دی تھیں، اور وہ قوانینِ براءت (INDEMNITY ACTS) جو انگریزی دورِ حکومت میں وقتاً فوقتاً پاس کیے گئے تھے، بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس تقابل سے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہماری یہ تجاویز اس انصاف کے حدود سے ذرہ برابر متجاوز نہیں ہیں جسے ایک غیر قوم اس ملک پر حکومت کرنے میں ملحوظ رکھتی تھی۔



[1] اولیاری ص ۱۸۱